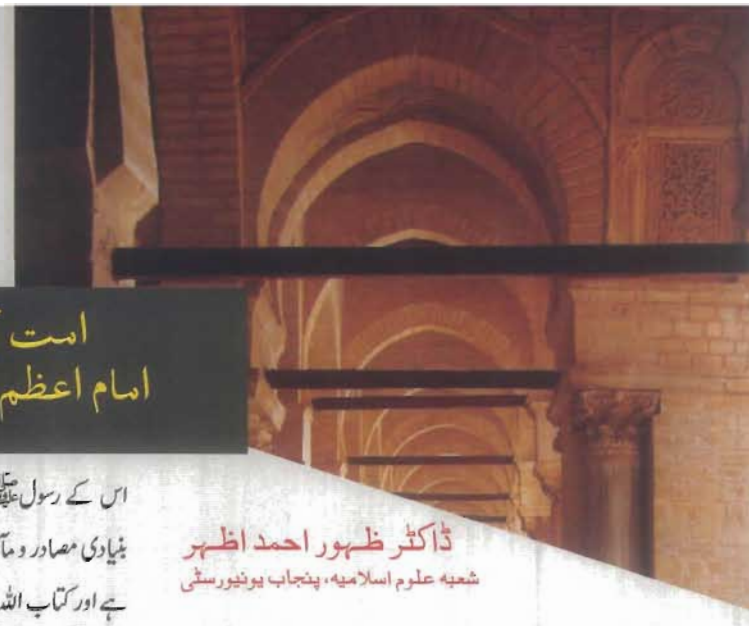

امت کو درپیش مسائل کا حل
امام اعظم کی فقہی آراء کی روشنی میں

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

اسلامی فقہ کی تاریخ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے پائے کا کوئی اور فقیہ نظر نہیں آتا، روشن طبع، حاضر جوابی، باریک بینی، وسعتِ نظر، قوتِ استدلال، صحتِ استنباط اور نت نئے پیدا ہوتے اور ابھرتے مسائل اور مشکلات کا فوری اور تسلی بخش حل پیش کرنے میں ان کا جواب نہیں ہے۔ آج کی مسلم دنیا کو جو تحدیات یا چیلنجز (challenges) درپیش ہیں یا سامنے آسکتے ہیں ان کے تسلی بخش حل اور فوری جوابات کے لیے بھی ان کی فقہی آراء، طریقہ کار، اندازِ استدلال اور اسلوبِ استنباط سے مدد لی جاسکتی ہے بشرطیکہ حضرت امام کی سیرت اور کردار کے ساتھ ساتھ ان کی فقہ کا بھی گہرا مطالعہ کرلیا جائے اور ان کے تدریسی، تصنیفی اور تحقیقی کارناموں کی تفاصیل بھی ہمارے سامنے ہوں۔

حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ فقہ یا قانون کا اصل مقصد فرد اور معاشرہ کا تحفظ اور مشکلات سے نجات ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عقل و بصیرت بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہے کیونکہ اگر ایسے نہ ہوتا تو کتاب اللہ عقل و تدبر سے کام لینے کا حکم نہ دیتی اور رسول اللہ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ **الدین یسر** یعنی دین تو سراپا آسانی ہے اور یمن کے لیے بھیجے جانے والے حاکم اور قاضی صحابہ سے یہ نہ فرماتے کہ **یسرا ولا تعسرا** یعنی تم دونوں سہولت و آسانی سے کام لینا اور مشکل اور تنگی والی روش اختیار نہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے مدبر و مفکر اور فقیہ صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ پوچھا تھا کہ اگر کسی شرعی مسئلہ اور قانونی پہلو سے متعلق قرآن و سنت سے رہنمائی نہ ملی تو پھر کیا کرو گے؟ تو انہوں نے عرض کیا تھا کہ اجتھد برأیی یعنی میں اپنی عقل اور سوچ سے کام لینے میں انتہائی کوشش کروں گا تو آنحضرت ﷺ نے انتہائی خوش ہو کر ارشاد فرمایا تھا کہ الحمد للہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بھیجے ہوئے نمائندے کی سوچ بھی وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ہے اس موقف اور ارشادِ نبوی سے حضرت امام اعظم کو دو نقطے ہاتھ آئے ایک یہ کہ انسانی سوچ، عقل و فکر اور تدبر کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ اسلام کے بنیادی مصادر و مآخذ میں سے ہے اور اسی اجتہاد بالرائے کو قیاس بھی کہا گیا ہے اور کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع کے بعد چوتھا مصدر اور اسلامی فقہ کا سرچشمہ یہی قیاس و اجتہاد ہے، رسول اکرم ﷺ کے اس موقف و ارشاد سے دوسرا نقطہ یہ میسر آیا کہ فوری انصاف اور بروقت فیصلہ کے لیے تاخیر یا ٹال مٹول بے انصافی یا عدل و انصاف کے انکار کے مترادف ہے۔ جو انسانی مسائل فوری حل اور لازمی فیصلہ کے متقاضی ہوتے ہیں انہیں کھٹائی میں ڈالنا نہ صرف بے پناہ نقصان کا باعث ہوسکتا ہے بلکہ یہ ٹال مٹول کے عنوان سے ایک قسم کی نالائقی یا نااہلیت بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ مدینہ شریف سے یمن کوئی زیادہ دور نہیں، اگر فوری نوعیت کے فیصلے بلاتاخیر خلق خدا کو حصولِ انصاف سے محروم یا زحمتِ انتظار سے بچانا مقصود نہ ہوتا تو حضرت معاذ بن جبل یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں بھی اس وقت کے مروج ہوائی جہاز، برق رفتار گھوڑے پر حاضر خدمت ہو کر اسی طرح ہدایت لے لیا کروں گا جس طرح اللہ کا بندہ حضرت اویس قرنی اپنی والدہ سے اجازت لے کر صحبتِ نبوی سے مشرف ہونے کے لیے پیدل دوڑتے ہوئے آئے تھے اور کسی غزواتی مہم پر مدینہ منورہ سے باہر ہونے کے باعث رسول اللہ ﷺ کی زیارت کیے بغیر ہی انہی قدموں پر پیدل دوڑتے ہوئے یمن میں اپنی والدہ ماجدہ کی دیکھ بھال کے لیے واپس آ گئے تھے، یارسول اللہ ﷺ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ اگر کوئی مسئلہ الجھ جائے اور کتاب و سنت سے اس کا حل میسر نہ آسکے تو تیز رفتار گھوڑے پر آجانا اور پوچھ کر واپس چلے جانا بلکہ امت کو یہ سمجھایا کہ انصاف کا حصول فوری اور آسان ہونا چاہیے اور یہ بھی کہ مسلمان قاضی اور حاکم کو اپنی عقل و فکر کو کام میں لاتے ہوئے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اخلاص اور نیک نیتی سے اجتہاد کرنا چاہیے خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو کیونکہ فرمان نبوی یہ ہے کہ ''**من اجتھد فاصاب فلہ أجران، ومن أخطأفلہ اجر واحد**'' یعنی جس نے اجتہاد کیا اور اس کا اجتہاد درست نکلا تو اسے دو اجر ملیں گے (ایک اجتہاد کا اور دوسرا اجتہاد کے درست ہونے کا) اور اگر اجتہاد میں غلطی ہوگئی تو صرف ایک گونہ اجر ملے گا (اور وہ اجتہاد کرنے کا ہوگا)!

یوں گویا شریعتِ حقہ کا اصل مقصد انصاف کو فوری، سستا اور آسان بنانا ہے

اور اس کے ساتھ ہی مسلمان کو انفرادی اجتہاد کے لیے آزاد چھوڑنا بھی مقصود ہے تاکہ خود اعتمادی پیدا ہو اور اسلامی تمدن کی بے پناہ قوتِ متحرکہ یعنی اجتہادی عمل کو فروغ ملے اور قوتِ فیصلہ آزادی کے ساتھ روبہ عمل ہو۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا فقہی مسائل کے حل کے لیے طریقۂ عمل بھی یہی تھا، اموی خلافت کے ظالمانہ نظام حکومت کے زوال اور خاتمہ کے بعد اور بنو ہاشم یا بنو عباس کی خلافت کے آغاز پر حضرت امام جب حجاز سے عراق واپس آ گئے اور مکہ مکرمہ کے بجائے پھر سے کوفہ کو اپنا مرکزِ عمل بنا لیا تو پھر وہاں انہوں نے مسلم فقہاء اور مقننین کی ایک اکیڈمی قائم کی جہاں سینکڑوں فقہاء نے تربیت پائی اور آزادانہ بحث اور تحقیق کو بنیادی اہمیت دی، ہر مسئلہ پر آزادانہ بحث ہوتی تھی اور حضرت امام اعظم بڑے سکون اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے اپنے شاگردوں کی باتیں سنتے، ہر ایک سے رائے لیتے اور جو بہترین رائے یا مسئلہ سب سے اچھا سامنے آتا اسے قبول کر لیا جاتا، بتایا جاتا ہے کہ اس طرح زیر بحث آ کر حل ہونے والے فروعی مسائل کی تعداد تراسی ہزار سے بھی متجاوز تھی بعد میں یہی فیصلے فقہ حنفی کے لیے مضبوط بنیادیں ثابت ہوئے۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ طریقہ بحث و اجتہاد دراصل اسلام کے نظام شورائیت کے احیاء اور ترقی کا آئینہ دار بھی تھا، قائداعظم محمد علی جناح نے جب یہ کہا تھا کہ جمہوریت تو مسلمانوں کے رگ و پے میں شامل ہے جو مذہب کے سلسلے میں بھی جمہوری شورائی انداز اپناتے ہیں تو غالباً ان کے سامنے یا ان کے ذہن میں حضرت امام اعظم کا یہی طریقہ بحث و اجتہاد تھا، کیونکہ باہمی مشاورت تو اسلامی نظام کی روح ہے۔ تیرہ سالہ مکی دور اسلام میں دارِ ارقم مسلمانوں کا شورائی جمہوری مرکز تھا جہاں "وامرھم شوریٰ بینھم" یعنی مسلمانوں کا نظام تو باہمی مشاورت سے چلتا ہے، کے مطابق کام ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ بھی یہاں صحابہ کرام کی تربیت فرماتے تھے اور تمام معاملات میں شورائی انداز اختیار کرنے کے لیے انہیں تیار کرتے تھے۔ ایک اور مکی سورۃ الزمر میں یہ آیت بھی ہے جو مسلمانوں کے شاندار شورائی طریقہ عمل خصوصاً فقہی اجتہادی مسائل کے طریقہ عمل کی نشاندہی کرتی ہے جسے حضرت امام اعظم نے اپنے کوفی مرکزِ تربیت کے لیے نصب العین کے طور پر اپنا لیا تھا اور وہ آیت ہے: اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ. یعنی یہ ایمان والے اور شورائی نظام والے وہ لوگ ہیں جو ہر بات کان لگا کر بڑے غور سے سنتے ہیں پھر جو بہترین قول یا رائے سامنے آتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں"

اس آیت کو اگر مسلمانوں کے نظامِ حکومت اور ان کے فقہی نظام تربیت کی اصل اور روح قرار دے دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ اس میں جس نظام حکومت اور نظام تربیت کی نشاندہی کی جا رہی ہے اس میں ہر فرد کو آزادانہ رائے کے اظہار اور ہر بولنے والے کی بات (خواہ وہ حزب مخالف ہی سے کیوں نہ ہو) کو پوری توجہ اور غور سے سننے کی تلقین کی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دی جا رہی ہے کہ جو قول سب سے زیادہ مستحسن ہو اور جو رائے سب سے زیادہ خوبصورت ہو، وہ خواہ حزب مخالف ہی کی کیوں نہ ہو، خواہ کہنے والا چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اسی پر عمل ہوگا!

بنو امیہ نے تو اسلامی خلافت کو ملوکیت میں بدل کر آمریت اور استبداد کی راہ اختیار کر لی تھی، چنانچہ امام ابو حنیفہ، جو فقہی مسائل میں بھی شورائیت اور جمہور علماء کی رائے کو برتر و افضل تصور کرتے تھے، اس استبدادی اموی نظام کے خلاف تھے، یہی وہ نظام استبداد تھا جسے سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسترد کرتے ہوئے اس پر کربلا کے میدان میں اپنی شہادت عظمیٰ سے ضرب کاری لگا کر اسے کھوکھلا کر دیا تھا اور پھر انہی کے پوتے حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت نے فیصلہ کن ضرب کاری لگا کر اسے بالکل نیست و نابود کر دیا تھا، حضرت زید کی شہادت کے بعد صرف سات سال میں اموی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ان سات سالوں میں یکے بعد دیگرے سات خلفاء برسر اقتدار آئے مگر اموی خلافت کی گرتی ہوئی دیوار کو کوئی بھی نہ سنبھال سکا۔ امام اعظم نے سادات بنو ہاشم کی بنی امیہ مخالف سیاسی تحریک کا دل و جان سے ساتھ دیا اور مالی اعانت بھی کی مگر بنو امیہ کی جگہ بنو عباس نے لے لی تو وہ بھی آمریت و استبداد کے علمبردار نکلے، اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ نے عباسیوں کو بھی مسترد کر دیا اور ان سے تعاون کی بجائے قید و بند کی مجاہدانہ روش کو ترجیح دی اور انسانیت کا مقدر سنوارنے کے لیے دوررس اور انقلابی نقطۂ نظر رکھنے والی تاریخ کی انوکھی اور نادرِ روزگار شخصیات یونہی کیا کرتی ہیں، اگر وہ حالات کے جبر و قہر کے باعث اپنی زندگی میں کوئی بڑا قدم اور مخیر العقول کارنامہ انجام نہ بھی دے سکیں تو کم سے کم اپنے پیچھے خطوط و علامات چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے جو علامات و نشانات کی مدد سے ان خطوط اور دھاگوں کو شناخت کرتا ہے اور ان کی مدد سے آگے بڑھنے کا سامان کرتا ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ جو خطوط اور نشانات چھوڑ گئے ہیں ان میں سے میں یہاں صرف دو کی شناخت اور نشاندہی پر اکتفا کروں گا، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ وہ امت کے لیے آمریت اور مطلق العنان و مستبد بادشاہت کے قطعی خلاف تھے، دوسرے وہ اجتہاد بالرائی (عقل و فکر کو تھکا دینے والی عالمانہ اور فقیہانہ کوشش) کے اسلامی طریقہ قانون سازی اور تدوین فقہ کو ان بلندیوں پر لے جانا چاہتے تھے ان کا میدان تو اجتہاد بالرائی کی علمی و فکری دنیا تھی اور وہ اسی کے لیے پیدا کیے گئے تھے، اسی لیے وہ "نام نہاد عباسی انقلاب" کی کامیابی پر خوش ہو کر اور بڑی توقعات لے کر فوری طور پر حجاز سے عراق منتقل تو ہوئے تھے اور فقہی تدوین کی ایک ایسی فقہی اکیڈمی قائم کر

دی تھی جس نے قلیل سی مدت میں تراسی ہزار سے زائد فروعی مسائل پر اپنے ساتھیوں کی شورائی بحث وتمحیص کے ساتھ اجتہادی کام مکمل کر دیا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ اندرونی اور بیرونی عناصر کی مداخلت نے ساداتِ بنو ہاشم کی کسی بھی جمہوری کوشش کو پروان نہ چڑھنے دیا بلکہ الٹا حضرت امام اعظم کی شورائی تدوین فقہ کا رستہ روکنے کے لیے ان سے تعاون مانگا بلکہ سو لالچ بھی دیئے مگر آمریت واستبداد کے ایجنٹ بری طرح ناکام ہوئے اور حضرت امام کو قید و بند میں ڈال دیا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ دنیائے انسانیت کو کیسا سیاسی نظام دینے کے لیے مبعوث ہوئے تھے؟ کیا ایک نئے شاہی خانوادہ کی بنیاد رکھنے کے لیے آئے تھے؟ ہرگز نہیں، کیا وہ پھر سے انسانیت خصوصاً جزیرہ عرب کے مسلمانوں کو خانہ بدوشی اختیار کرنے کی تلقین کرنے کے لیے تشریف لائے تھے؟ بالکل نہیں، واقعات کی شہادت ان دونوں باتوں کی قطعی نفی کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول اولین و آخرین ﷺ دنیا کو شورائی نظام عطا کرنے کے لیے آئے! ایک ایسا شورائی نظام جس میں ہر شہری کو بلاامتیاز رنگ ونسل اور مذہب وعقیدہ یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے ملک کی سیاسی وعسکری تقویت و ترقی میں آزادانہ رائے کا حقدار ہو! یہ وہ شورائی انداز ہے کہ انگل سام، فرانس کے سرکوزی اور برطانیہ کے بلیئر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی! جن کے نام نہاد سیکولر جمہوری نظام پر مسلمان عورت کے دوپٹے اور مسلمان نوجوان کے چہرے پر داڑھی کے چند بالوں سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور سرکاری ایوانوں میں زلزلہ آجاتا ہے۔

مکی عہد میں ہی مسلمانوں کا نظام باہمی مشاورت (امرھم شوریٰ بینھم) کی بنیاد پر قائم ہو چکا تھا، مدنی عہد میں رسول اکرم ﷺ نے ہر قدم پر اور ہر معاملہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت فرمائی، صرف غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے ساتھیوں سے کم سے کم سات بار مشورہ کیا، غزوۂ احد کے موقع پر اپنے خواب مبارک کی تعبیر کے برعکس اپنے نوجوان صحابہ کی غالب اکثریت کی رائے پر عمل کیا اور دفاعی جنگ کے بجائے میدانِ کارزار میں کوہِ احد کے دامن میں آ گئے، بعض مسلمانوں کی غلطی اور حکم رسول اللہ ﷺ سے روگردانی کے باعث جیتی ہوئی جنگ کے باوجود مسلمانوں کو نقصان سے دوچار ہونا پڑا! اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ چونکہ مشاورت کے باوجود جنگِ احد میں نقصان اٹھانا پڑا اس لیے حکم آ جاتا کہ آج کے بعد آپ ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ نہیں لینا بس ہر معاملہ میں اللہ کا حکم آ جایا کرے گا اور بجا لانا سب پر لازم ہوگا مگر اس کے برعکس سخت تاکید فرمائی گئی کہ مسلمانوں سے مشاورت کا سلسلہ ہر حال میں جاری رکھیے! دراصل اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ مسلم امہ میں خود اعتمادی پیدا ہو اور شورائی نظام ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر جائے کہ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کو حکومت کے معاملات میں آزادانہ حصہ لینے کا موقع ملتا رہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عبقری سیاستدان اور مثالی عدل گستر حکمران کو بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک بوڑھی عورت اور ایک عام مسلمان برسرِ عام روک ٹوک سکے اور اسے ان کا حق سمجھا جائے۔

یہ جو ارشاد نبوی ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا دروازہ ہیں تو اس کی صحت پر مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا مجھے اپنے ایک گنہگار مسلمان ہونے کا یقین ہے!! کیونکہ واقعاتی شہادت یہ کہتی ہے کہ جس شورائی نظام سیاست وحکومت کی تعلیم و تربیت اور تلقین و تاکید رسول اکرم ﷺ نے اپنے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو فرمائی تھی اسے سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم اور آپ کی اولاد خصوصاً حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ان کے پوتے حضرت زید بن علی زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے ساداتِ بنی ہاشم نے خلافتِ راشدہ کے نہج پر قائم رکھنے کے لیے ایک تحریک کی شکل دے دی تھی جس کی تائید اور حمایت حضرت امام اعظم نے بھی فرمائی، نہ صرف زبانی تائید فرمائی بلکہ مالی امداد بھی دی جس کے نتیجہ میں بنو امیہ اور بنو عباس دونوں کا حضرت امام پر عتاب نازل ہوا اور قید و بند کی سزائیں کاٹیں۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے سے اتفاق نہ کیا کہ الرفیق الاعلیٰ سے وصال سے کچھ لمحے پہلے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا جائے کہ ان کے بعد خلافت اور جانشینی کس کا حق ہوگا اور اگر تو یہ بنی ہاشم کا حق ہے تو ہم درخواست کریں گے کہ اس کا اعلان فرما دیجئے اور اگر نہیں تو بھی ان سے درخواست کریں گے کہ بنی ہاشم کے حق میں وصیت کر جائیں! مگر علم کے دروازے کو صحیح صحیح علم تھا کہ علم کے شہر میں خلافت کے متعلق کیا چھپا ہوا ہے؟ وہ رسول اولین و آخرین (پیدائش کے لحاظ سے اول اور بعثت کے لحاظ سے آخری) رسول ﷺ کا جو تیئس سال مکی و مدنی عہد نبوت میں امت کو شورائیت کی تربیت دیتے اور تاکید کرتے رہے، وہ تو امتِ مسلمہ میں قوتِ فیصلہ کی خود اعتمادی پیدا کر گئے تھے تاکہ وہ خود اپنی آزادانہ مرضی سے اپنے حکمران منتخب کر سکیں اب ان سے یہ سوال کرنا گویا معاذ اللہ ان کی اس تربیت و تاکید پر پانی پھیرنا ہے! اس کے بجائے باب مدینۃ العلم نے ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ہوسکتا ہے کہ آپ یہ فرما دیں کہ بنو ہاشم تو کبھی حکمران بن ہی نہیں سکیں گے اور ہمارے راستے بند ہو جائیں گے۔ ''ولئن منعنا ھا لن ننالھا أبدا'' ''یعنی اگر ہمیں منع کر دیا گیا تو ہم کبھی خلافت حاصل ہی نہیں کر پائیں گے''۔

یہ تو وصال نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت مدینہ منورہ کا منظر تھا، اب

ذرا شہادتِ علی مرتضیٰ علیہ السلام کے وقت کوفہ کا ایک منظر بھی دیکھتے ہیں۔ ملعون ابن ملجم کی زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہو چکی ہے کہ ''اے علی! ایک بدترین خلق وہ تھا جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی ماردی تھی اور دوسرا بدبخت ترین خلق (اشقی البریہ) وہ ہوگا جو تیرے اس سر کے خون سے تیری اس داڑھی کو سرخ کر دے گا!'' اور طبیب یہ بتا چکے ہیں کہ اب امیر المؤمنین کے جاں بر ہونے کی امید نہیں ہے! تب آپ کو مشورہ دیا گیا کہ اپنے بعد میں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا اعلان فرما دیجئے مگر آپ نہیں مانے اور فرماتے ہیں کہ اگر میں اپنا جانشین نامزد کرتا ہوں تو ایک شخصیت ایسا کر چکی ہے جو مجھ سے افضل تھے یعنی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لیکن اگر میں نامزد نہیں کرتا تو اس ہستی کی سنت پر عمل کرتا ہوں جو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی افضل تھے یعنی رسول اللہ ﷺ!

یہ وہ سبق تھا جو علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دے گئے اور یہ وہ روح تھی جو وہ اپنی اولاد میں پھونک گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے شورائی نظام کو بحال کرنا ہے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرنا! چونکہ خلفائے راشدین-- صدیق و فاروق وعثمان رضی اللہ عنہم-- حق پر تھے اس لیے سیدنا و مولانا ابوالحسن علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے قاضی، مشیر اور مددگار بھی رہے مگر یزید کی حکمرانی اور بعد میں بنو امیہ اور بنو عباس سب کی حکمرانی ایک آمریت و استبداد تھا۔ اس لیے سادات بنی ہاشم رضی اللہ عنہم نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ نے بھی سادات بنی ہاشم کی ایسی تحریک کا پورا پورا ساتھ دیا اور اس ضمن میں نہ کسی سے دبے اور نہ کسی لالچ کی پرواہ کی۔

تو اس طرح شورائی نظام جو درحقیقت ''نظام مصطفوی'' ہے نہ صرف سادات بنو ہاشم کی منزل مراد ہے بلکہ حضرت امام اعظم کا مطلوب و مقصود بھی ہے! یہ شرف برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو نصیب ہوتا ہے کہ وہ بیسویں صدی عیسوی میں اپنے شورائی جمہوری ووٹ سے دولت خداداد پاکستان قائم کرتے ہیں اور اگر اب اس اکیسویں صدی عیسوی میں پاکستان کے مسلمان ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے تحفظ و دفاع میں کامیاب ہوتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہو کر رہیں گے!) تو یہ سادات بنی ہاشم اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں بہت بڑا خراج عقیدت ہوگا اور ''نظام مصطفیٰ'' قائم ہوگا جس میں میثاق مدینہ کے مطابق ہر شہری کو بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب و عقیدہ حکومت میں برابر کا حق اور اختیار ہوگا! جمہوری سیکولر ازم تو انکل سام، سرکوزی اور بلیئر کی فریب کاری ہے اگر حکومت کی غیر جانبداری سیکولر ازم ہے تو پھر انسانی تاریخ میں غیر جانبدار حکومت تو صرف اور صرف ایک ہی ہوئی ہے اور وہ حکومت ہے جو میثاق مدینہ کی بنیاد پر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے مدینہ منورہ میں قائم فرمائی تھی!

یہ حضرت امام کا سیاسی موقف اور نظریہ تھا جہاں تک قانون اور فقہ کا تعلق ہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک قانون کا اولین مقصد اور فائدہ فرد اور معاشرے کا تحفظ اور مشکل سے فوری نجات ہے کیونکہ اگر قانون معاشرتی تحفظ نہ دے سکے یا مشکل کا فوری حل نہ نکال سکے تو پھر لوگوں کا قانون پر اعتماد نہ ہو سکے گا اور انصاف میں تاخیر بھی دراصل انصاف کا انکار ہوگا امام صاحب نے جو تراسی ہزار سے زائد مسائل بحث و تمحیص کے بعد حل کیے تھے ان کی بعض جھلکیاں علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''سیرت نعمان''، مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی'' شاہ ابوالحسن زید فاروقی کی کتاب ''سوانح بے بہائے امام اعظم ابو حنیفہ'' اور شیخ ابوزہرہ کی کتاب ''ابوحنیفه حیاته و آثار و اراء ه الفقهیة'' میں بکثرت ملتی ہیں اور فقہی مسائل کے حل کے لیے امام اعظم کے ان فیصلوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شہری کے تحفظ کے ساتھ ساتھ شہری کی مشکلات کا فوری حل (relief) مقصود ہوتا تھا۔

آج کے الجھے ہوئے مسائل کے حل کے لیے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ استنباط سے استفادہ کے ساتھ ساتھ ویسی ہی فقہی روح اور قوت فیصلہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی گوناگوں مشکلات میں سب سے خطرناک و خوفناک اقتصادی و مالیاتی مسائل و مشکلات ہیں اور ان میں بھی سود کا مسئلہ سرفہرست اور سب سے زیادہ الجھا ہوا ہے، حرمت سود کے خداوندی اعلان بلکہ سود خوروں کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد رسول اللہ ﷺ تقریباً تین ماہ میں ہی دنیا سے رحلت فرما گئے اور اس جنگ کو جیتنے کے لیے مسلمان آنحضرت ﷺ کی ہدایت و رہنمائی سے محروم رہ گئے اور اس محرومی کا شکوہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم و جلیل مدبر اور دور بین قائد نے بھی کیا تھا۔ سود ایک ایسی لعنت ہے جس نے خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد اموی دور میں ہی پہلے سے بھی زیادہ بری طرح امت مسلمہ کو دبوچ لیا تھا۔ پھر عباسی دور میں اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا حتیٰ کہ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب میں تو سب سے بڑا سبب سود کی یہی لعنت ہے۔ عصرِ حاضر میں تو سود لوہے کی ایک ایسی چادر بن چکا ہے جو پورے کرۂ ارض کے اوپر تن گئی ہے اور کوئی فرد، کوئی قوم اور کوئی بھی ملک اس کی گرفت سے باہر منہ نکال کر سانس بھی نہیں لے سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج عالم اسلام کو پیش آمدہ مسائل میں سے ''ربا'' سب سے زیادہ مشکل اور پریشان کن ہے اور دور حاضر کے ہمارے فقہاء وعلماء اور قانون دان اس کا تسلی بخش حل پیش نہیں کر سکے یا کم سے کم اس کے کسی مستقل یا وقتی اور عارضی حل پر متفق نہیں ہو سکے، اگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے عالم اسلام کے اہل علم

پر مشتمل فقہی اکیڈمی قائم کی جائے اور اس مسئلہ پر کھلے عام بحث کی جائے تو کم سے کم عارضی اور وقتی یا ہنگامی حل تو سامنے آ سکتا ہے اور پھر اسے اسلامی ملکوں کی قومی اسمبلیوں اور مجالس شوریٰ میں بھی زیر بحث لایا جاسکتا ہے، اس طرح قرآنی روح کے مطابق سامنے آنے والے بہترین قول پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

۱- سود کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لفظی موشگافیوں کا سہارا لیتے ہوئے یہ کہنا تو جان چھڑانے والی بات ہے کہ بینک کے منافع پر ''ربا'' کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ بینک دراصل چالاک سود خوروں کی ان ایجادات میں سے ہیں جو سود خوری کو تمام خطرات اور مشکلات سے پاک اور آسان سے آسان تر بنانے کے حیلے کرتے رہتے ہیں اور جن میں سے تازہ ترین حیلہ کریڈٹ کارڈ ہے۔

۲- ربا یا سود مادہ پرست اور استحصالی ذہن کا وہ خوفناک جال ہے جس میں پوری انسانیت کو بری طرح جکڑ دیا گیا ہے، مشرق و مغرب کا ہر انسان اگرچہ اس سود کے بینکاری نظام سے بظاہر سہولیات بھی حاصل کررہا ہے مگر حقیقت میں تمام انسانیت اس سے بیزار ہے اور اس کے متبادل کی آرزومند ہے، ماؤ رائے تنگ نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا بدترین ہتھیار سود ہے، اسی لیے اسلامی شریعت نے پندرہ صدیاں قبل اسے شیطانی پاگل پن قرار دے کر قطعی حرام قرار دے دیا تھا اور رب العالمین نے اس شیطانی جادو کے خلاف جنگ کا اعلان فرما دیا تھا اس لیے اب سود کی حلت یا حرمت کی بات نہیں ہوگی بلکہ اس شیطانی جادوگری کی بیخ کنی اور نیست و نابود کر دینے کی جنگ کو آگے بڑھانے کی بات ہوگی اور یہ جنگ بڑھانا اور جیتنا خدائی فیصلہ ہے جو نافذ ہو کر رہے گا۔

۳- اصل کام بینکاری کے سودی نظام کا متبادل نظام لانا اور عارضی یا مستقل طور پر سود سے نجات کی عملی تجاویز سامنے لانا ہے، سودی نظام کے مستقل خاتمہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کردہ جنگ کو جیتنا ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا منکر یعنی برائی ہے جس کے لیے پہلے قلبی و ایمانی پھر زبانی اور بالآخر طاقت کے استعمال کا عملی جہاد کرنا پڑے گا۔

۴- جب تک مادیت پرست استحصالی ذہن کی گرفت سے انسانی معاشرہ آزاد نہیں ہوتا، اس کی جگہ انفاق فی سبیل اللہ ایک مستقل معمول نہیں بن جاتا، قرض حسنہ دینے والا انسانی رویہ سامنے نہیں آتا اور بلاسود مگر باضمانت قرضہ دے کر تمام افراد معاشرہ کو آگے بڑھنے کے لیے یکساں مواقع دینے کے لیے باقاعدہ حکومتی نظام وضع نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اسلامی فلاحی معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا جس میں سرمایہ پرستی ایک لعنت اور جرم ہوگا، جہاں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا، بلکہ ہر کوئی ہر کسی کا دستگیر و مددگار ہوگا اور سورۃ بلد میں حکم ربانی کے مطابق دو کام ہر فرد بشر کا مسلّم فرض بن جائیں گے(۱) اپنے ابنائے جنس کو بھوک اور افلاس سے نجات دلانا(۲) تمام انسانوں کی آزادی کی ضمانت دینا! یہی وہ اسلام کا مطلوب فلاحی معاشرہ ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ:

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس!

۵- سود ایک ایسا معاشرتی منکر یا معاشرتی برائی ہے جس کے لیے قلبی، زبانی اور عملی جہاد درکار ہوگا، ہر مسلمان ملک اور ہر اسلامی تنظیم کو ایک ایسا شعبہ قائم کرنا ہوگا جو پہلے زبان اور قلم سے خلق خدا کے دلوں کو گرمائے کہ وہ اس انسانیت دشمن سودی نظام کو پہلے دل سے، پھر زبان سے اور بالآخر طاقت سے ختم کر دیں۔ سود خوری کے اس کبوتر کی گردن مروڑ دیں جس میں سود خور دیو کی جان ہوتی ہے۔ منظم، یکسو یک زبان خلق خدا کے سامنے سود خوری کے دیو نہیں ٹھہر سکیں گے! لیکن اس لشکر خدا وندی کا پہلا دستہ اسلامی دنیا سے تیار ہونا چاہیے مگر مکمل لشکر خلق تب بنے گا جب مسلم و غیر مسلم کی قید و امتیاز کے بغیر مشرق و مغرب میں اس شیطانی سودی نظام کی ستائی ہوئی تمام خلق خدا اس تحریک میں شامل ہوگی۔

۶- سود سے نجات کے لیے وقتی اور عارضی انتظام کے ضمن میں اقدامات کرنا پڑیں گے، ایک تو اسلامی بینکوں کے رواج اور نظام کو آگے بڑھانا اور تقویت دینا ہوگی، لیکن اس سے سودی نظام کے مطابق چلنے والے بینکوں کا کوئی جواب یا مقابلہ نہیں ہوسکے گا، بس ایک وقتی اور عارضی انتظام ہے جو حلال سرمایہ کاری، پوری جانفشانی سے محنت اور بہت سارے اخلاص اور عزم نیک کا محتاج ہے۔

دوسرے زکوٰۃ اور عشر کے نظام کو محلے اور گاؤں کی سطح پر منظم کرنا ہوگا، وہاں کے دولت مندوں سے پیسہ لیکر وہیں کے حاجتمندوں کو ان کی خود داری کو مجروح کیے بغیر دینا پڑے گا۔ اس کام کے انتظام کے لیے کمیٹیاں درکار ہوں گی جن میں عوام کے منتخب اور حکومت کے نامزد ارکان شامل ہوں گے یہ سلسلہ تحصیل، ضلع، صوبہ اور پھر ملک کی سطح تک بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔

تیسرے جب تک مخیّر، خدا ترس اور ہمدرد فلاحی معاشرہ آج کے مادہ پرست، سنگ دل اور استحصالی معاشرہ کی جگہ نہیں لے لیتا اس وقت تک سودی بینکوں میں سرمایہ رکھنے والے لوگوں کو بینک سے منافع لینے کی نہ صرف عارضی طور پر اجازت ہونی چاہیے بلکہ وہ یہ رقم اسی صورت میں لیکر اپنے کام میں لاسکتے ہیں اگر وہ خود کو جائز حاجت مند سمجھتے ہیں ورنہ یہی رقم اس طرح خلق خدا میں تقسیم کر دینی چاہیے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کو شرط جیتنے پر تمام سرمایہ وصول کر کے مستحقین میں بانٹ دینے کا حکم فرمایا تھا۔ اسلامی تاریخ و سیرت کے طالب علم جانتے ہیں کہ ایرانیوں پر رومیوں کے دوبارہ فتح پانے اور بدر میں اہل ایمان کی کامیابی کے متعلق سورۃ الروم کی ابتدائی آیات میں پیشن گوئی پر ایک کافر سردار قریش نے حضرت ابوبکر سے شرط باندی تھی، کتاب اعجاز کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہونے پر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ شرط جیت گئے تھے چنانچہ اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی میں آج قربانی کے جانوروں کی کھالیں اور گوشت دنیا بھر کے مستحقین تک اسلامی بینک کے توسط سے پہنچائے جا رہے ہیں اور اسی اصول کے مطابق آج عرب اپنے تیل پر حاصل ہونے والا سودی سرمایہ بھی یورپ اور امریکہ کے یہودی بینکاروں سے وصول کر کے فتوے کے مطابق مستحقین کی ضرورت پر خرچ کر رہے ہیں ورنہ شروع میں قربانی کے جانور ذبح کر کے بلڈوزروں کے ذریعے سالم دفن کر دیئے جاتے تھے۔ جبکہ علماء کی رائے پر سود کی حرام رقم عرب حکمرانوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں جب یہ پتہ چلا کہ سود کی یہی رقم یورپ اور امریکہ کے یہودی بینک اسرائیل کو دیتے رہے ہیں جس سے وہ دفاعی میدان میں عربوں پر برتری حاصل کر چکا ہے تو عرب حکمرانوں نے اسے وصول کرنا شروع کر دیا۔ یہ خیال بہت دیر بعد آیا مگر اب پچھتائے کیا ہوت۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ چار چیزوں میں سے بھی حسب ضرورت و مجبوری وقتی اور عارضی طور پر ہی سہی کچھ نہ کچھ کھا لینے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اسی پر قیاس کرتے ہوئے مجبوری اور ضرورت کے طور پر کچھ رقم استعمال کرنے اور باقی مستحقین میں تقسیم کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مگر اسلامی ملکوں کو غیر مسلم ملکوں اور تنظیموں سے اسی طرح پورا پورا سود لینا چاہیے جس طرح وہ مسلم اقوام اور ملکوں کی کھال اتار رہے ہیں اور اس حاصل شدہ سودی سرمایہ کو حسب ضرورت تصرف میں لانا چاہیے۔ اگر بقول ڈاکٹر حسین حامد حسان حضرت امام غزالی کے فتویٰ پر عمل کیا جائے تو مسلمان ملکوں کو یہ سودی سرمایہ ڈھیروں کے حساب سے جمع کر کے اپنی دفاعی اور دیگر ضروریات پر خرچ کر کے خود کو اتنا مضبوط بنا لینا چاہیے کہ وہ دنیا سے حق اور انصاف منوا سکیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا سے سود کو نیست و نابود کرنے کا مطالبہ بھی منوا سکیں۔

اگر ہم حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طرز استدلال اور اجتہادی آراء سے کام لیں تو فرمان نبوی: ''لا ضرر ولا ضرار'' (نہ نقصان پہنچانا، نہ نقصان اٹھانا ہے) اور الضرورات تبیح المحظورات (یعنی ضرورتیں ممنوع اور حرام چیزوں کو بھی مباح اور حلال بنا دیتی ہیں) پر عمل کرتے ہوئے مسلم افراد اور معاشرہ کے تحفظ کی غرض سے اور مشکلات سے فوری نجات کے لیے مندرجہ بالا اقدامات عارضی اور وقتی طور پر ہی سہی، عمل میں لائے جاسکتے ہیں، مگر اس کے لیے مجوزہ اور محولہ بالا طریقہ عمل اور طرز استنباط اپنانا پڑے گا۔

مگر اس کے لیے حضرت امام ابوحنیفہ کی طرح ایسی فقہی اکیڈمیاں قائم کرنا پڑیں گی جو بحث و تحقیق کے بعد فقہی فروعات کے حل سامنے لائیں اور پھر ان اکیڈمیوں کے فقہاء و علماء کی آراء جب عامۃ المسلمین کی تائید و قبولیت حاصل کر لیں تو انہیں فقہی مجموعوں میں شامل کر لیا جائے لیکن ان میں حکومتوں کا کوئی دخل نہ ہو بلکہ علاقے کے مسلمان یہ کام مل کر کریں۔ یہ کچھ خیالات و افکار ہیں جو مطالعے کے نتیجے میں ذہن پر ابھرتے ہیں، انہی فقیہانہ فتاویٰ اور مسائل کا حل بنانے اور ماننے کے لیے فقہی مصادر کا گہرا اور ہمہ جہت مطالعہ درکار ہوگا جس کے لیے یارانِ نکتہ دان کے لیے صلائے عام ہے۔

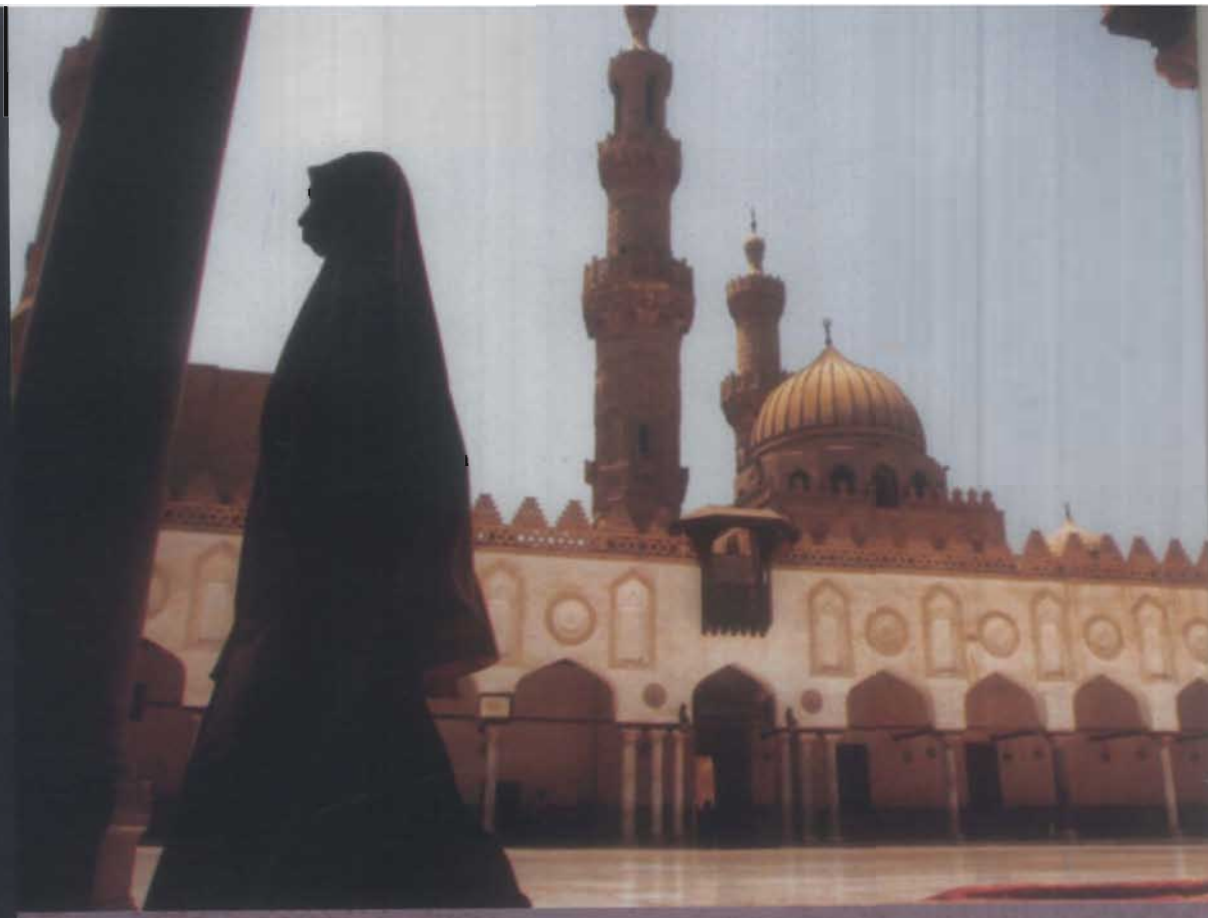

ڈاکٹر رابعہ شیخ
اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز
ڈی ایچ اے کالج، کراچی

جدید عالمی معاشرے میں بنتِ حوّا کا تشخص
(اسلام کے حوالے سے ایک نفسیاتی تجزیہ)